تعلیم الاسلام کالج ربوہ

غزل

دِلوں میں سوزِ محبت نظر میں حسنِ جمیل
یہی ہے اہلِ طریقت کی زندگی کی دلیل

مقامِ عشق سے واقف نہیں ہیں دیوانے
جنونِ شوق سے خالی ہے آگہی کی سبیل

اُجاڑ ڈالی تھی جس نے صنمکدوں کی بہار
ہُوا ہے پیدا زمانے میں پھر وہ بطلِ جلیل

ابھی تو جاری ہے دُنیا میں رسمِ تیشہ و سنگ
ابھی تو زندہ ہیں دُنیا میں کوہکن کے مثیل

ضمیر بیچ کر تیری وفا کے پروانے
جہانِ عشق و محبّت میں ہو گئے ہیں ذلیل

آشا شاہین

دیپک راگ

گا اے دل ......!

آج تو دیپک راگ گا!!

گا اے دل ...... کہ تیری شعلہ نوائی سے آسمان کے سینے پر چھائے ہوئے
بادلوں میں بجلی کے شعلے بھڑک اُٹھیں
اور بادلوں کے سینے چیخ چیخ کر پھٹ جائیں

گا اے دل ......!

آج تو دیپک راگ گا!!

گا اے دل ..... کہ تیری شعلہ نوائی سے آتش فشاں پہاڑ شعلوں سے
ہولی کھیلنے لگیں ....
اور ماؤنٹ ایورسٹ پر چھائی ہوئی بوڑھی برف
آگ میں تبدیل ہو جائے

گا اے دل ......!

آج تو دیپک راگ گا!!

گا اے دل ...... کہ تیری شعلہ نوائی تجھے ایک آتشیں شعلہ بنا دے
اور تو جل کر راکھ ہو جائے
ایک بے جان راکھ!!
سرد راکھ!!!

نظ

بیاہوں دل کے داغ نمایاں کئے ہوئے

الم نصیب مسلمانوں کے زوال و انحطاط اور زبوں حالی کی عبرت انگیز اور نصیحت خیز داستانیں ہر اُس مسلمان کے سینے پر نقش ہیں۔ جس کے دل میں غیرت حمیت اور قومی درد کی چنگاریاں موجود ہیں جبینِ وقت قدرت کی ستم ظریفیوں کی امانت دار ہے۔ لسانِ حال زمانے کی چیرہ دستیوں کی شکوہ سنجی میں مصروف ہے جب کبھی مسلمان سنجیدگی سے تاریخِ اسلام کے اوراق میں اپنے آباؤ اجداد کی خوش اقبالی کی رنگین داستانیں بکھرے دیکھتا ہے۔ تو اس کے الم آشنا دل سے آہوں کا طوفان اٹھتا ہے۔ جو چشم تر سے خوں فشانی اور لبِ خشک سے عرضِ حسرت بن کر اختتام پذیر ہوجاتا ہے کہ ؎

جس کے ڈر سے کانپ اُٹھتے تھے زمین و آسماں
کیا ہوئی وہ اے مسلمان شعلہ سامانی تیری؟

ایک زمانہ تھا کہ آہنی قلعوں میں محفوظ روما اور فارس کی وسیع اور طاقتور حکومتوں کے تاجدار (قیصر اور کسریٰ) کے دل مسلمانوں کے نعرہ ہائے تکبیر سے لرز جاتے تھے۔! آلاتِ حرب میں غرق فوج کے متلاطم سمندر میں مسلمانوں کے شکستہ نیزوں اور کند تلواروں کو دیکھ کر سکون آجاتا تھا۔

مگر آج جن کے آباء نے غلامی اور استبداد کی زنجیروں کو کاٹا تھا۔ خود آزادی کے لمحات کو ترس رہے ہیں۔ اگر آزادی مل چکی ہے۔ تو دیگر مصائب و آلام کی چلتی اور کڑکتی بجلیوں میں پل رہے ہیں۔ اُف ع

اک وہ بھی زمانہ تھا۔ اک یہ بھی زمانہ ہے!

دنیا کو آشنائے رموزِ تمدن کرنے والا مسلمان آج بے آسرا و بے سہارا مغربیت کے دامن دراز میں پناہ گزیں ہو رہا ہے۔

کل یہی مسلمان دنیا کے لئے بہارِ بے کراں تھا۔ آج خود خزاں رسیدہ چمن کا گل پژمردہ ہے آخر کیوں؟

اس کا جواب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے ؎

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
پھر پسر قابلِ میراثِ پدر کیونکر ہو (اقبال)

مسلمانوں نے اپنے اسلاف سے بہت کچھ پایا۔ مگر ان لعل ہائے بے بہا کو لات مار کر نئے تمدن کے حسین مگر بے حقیقت طلسمات کا گرویدہ ہو گیا۔ اسے اپنے آباء کے طریق نہ بھائے۔ قرآن کو مسلمان نے عقدۂ مشکل سمجھا۔ اور آسمان سے بیس صدیاں پرانے بزرگ کی عقدہ کشائی کے منتظر

بن گئے ـــــ یہ حالت تو عام مسلمانوں کی تھی ہوائے زمانہ میں سانس لینے کے بعد اس "نئے اندیشے" نے دورِ آزادی کا نام لے کر مذہب کو خیر باد کہا اور الحادیت کے شعلوں کی نذر ہو گیا۔ اُدھر پیرِ چرخ نے مسلمان کی غفلت آلود کم نگاہی سے تنگ آکر زمانے کے آشنا تھپیڑوں میں اُس کے شاخِ ثریا سے وابستہ آشیانے کے تنکوں کو پھونک ڈالا۔

اور مسلمان سیہ بختی اور زبوں حالی کی مہیب اور بھیانک راتوں میں قدرت کے طمانچے کے بعد اپنے ان گالوں کو جس پر یاسیت کی پپڑیاں جم چکی تھیں۔ سہلاتا رہا۔ تاریکی سے تنگ آکر اُس نے خواہشِ سحر کی مگر قدرت نے گرج کر کہہ دیا ع

اپنی نگاہِ ناز سے برہم ہیں آپ کیوں؟

مسلمان نے ہر چند شبِ زوال میں ظلمت کی صعوبتوں سے نجات حاصل کرنے کے لئے تہذیبِ حاضرہ سے کافوری شمعیں مستعار لے کر جلانا چاہیں مگر گردشِ دوراں کے شریر بار جھونکوں نے اس کی ہر سعی پر پانی پھیر دیا ـــــ آسمان کی طرف دیکھ کر مسلمان یہ کہہ کر خاموش ہو جاتا ہے ؎

کل تک تو تری باتوں سے مری روح تھی شاداب
اور آج کس انداز سے خاموش ہے تو بھی؟

یہ نوبت کیوں آئی؟

(۱) زمرۂ اسلاف جو مذہب کے نام پر جیتا اور مرتا تھا۔ ان کی اولاد نے مذہب سے کنارہ کشی اختیار کی شاہراہِ ترقی پر قدم مارتے وقت اُن نے وجہ کاوش اس مذہب کو قرار دیا! کاش ... لمحات کے وقت سوچتا کہ جن آباء کا وہ ذکر کر رہا ہے۔ مذہب ان کا شباب تھا۔ جو آج اُس کے نفس کے لئے بھرا کباب ہے۔ وہ آج جس چیز کو "مشغولہ" تصور کرتا ہے۔ اس نے کل اس کے آباء کے قدموں میں عدیم المثال ترقیات و فتوحات لاکر ڈال دی تھیں۔

اُس نے مغرب کا سرمہ آنکھوں میں ڈالا اور اس طرح "راز شناس نظر" سے محروم ہو گیا اُس نے ظاہر پرستی کی چادروں میں حقائق کے رازہائے سربستہ کو پوشیدہ کر دیا۔ غرض مذہب سے بے بہرہ ہو کر دہلا دینیت کی آغوش میں جا پڑا ـــــ اُس کی حالت دیکھ کر آقائے عاشور کو فرمانا پڑا ؎

قلب مسلم پر مسلط ہے فریب باطل
اس کو بھاتے ہی نہیں حق و صداقت کے طریق

دوسرا طبقہ اپنی علمی تہی مائیگی کی وجہ سے ط... عقائد اختیار کر کے پرستارِ اوہام بن گیا۔ آباء تو سر بکف اور تیغ بدست ہو کر دنیا سے شرک و بدعت کا خاتمہ کرنے کے لئے اُٹھے تھے۔ مگر "ناخلف اولاد" گور پرستی کرنے لگی ـــ ؎

قُم باذن اللہ جو کہہ سکتے تھے وہ رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن!

اور ان "مجاوروں" کو نوٹوں کی سرسراہٹ اور سکوں کی جھنکار راس آئی۔ اس "ذوقِ خانقاہی" کے

زہر ہلاہل نے مسلمانوں کی روحانیت کو بہت نقصان پہنچایا۔ اور "گورکھوں" نے ہدایت کی بجائے مسلمانوں کو جادہ کفر پر گامزن کیا ـــــ اقبال مرحوم نے خوب فرمایا ہے۔ ؎

"خانقاہوں میں کہیں لذتِ اسرار بھی ہے؟"

اس طرح سے مسلمانوں میں آہستہ آہستہ بیماریاں پھیلتی گئیں۔ اور برعکس اس کے اندر مادیت اور لادینی کے سریع الاثر زہر سرایت کرتے گئے آخر یہ حالت ہوگئی۔ ؏

"بت بھی کہتے ہیں مسلم نما کافر ہمیں"

(۲) مسلمان کا اپنے جامے سے باہر نکلنا محتاج بیان نہیں۔ "دُر مع الدہر کیف دار" پر ضرورت سے زیادہ عامل مسلمان کی فلسفہ دانی بھی منت کش تحریر نہیں۔ مسلمان تہذیب حاضرہ کے دل فریب اور حسین طلسمات کا اسیر ہوگیا۔ تہذیب حاضر کے آفتابی چہرہ نے اس کو رنگِ آشنائی بخش دیا۔ مگر وہ اس طلعت مکروہ کی بے حیائی اور خود تراشیدگی سے واقف نہ ہوسکا۔ یہ "مجنون" تقلید مغرب کی سرمہ آلود آنکھوں کا گرویدہ بن گیا۔ مگر اُن کی بے نوری کے اسرار اس پر نہ کھل سکے۔ خوابیدہ مسلمان اپنی قیمتی میراث لٹا بیٹھا ؎

لے گئے تثلیث کے فرزند میراثِ خلیلؑ
خشتِ بنیادِ کلیسا بن گئی خاکِ حجاز

اور مسلمان ـــــ جس کے عالمگیر معاشرے کی خوشہ چینی ہر قوم نے کی ہے خود تعالیٰ کی بھول بھلیوں میں اپنے مقصد کو فراموش کر بیٹھا ـــــ

اُس کی تہذیب و تمدن کے نازک جگر میں موت کے دیوتا نے اپنے زہر آلود خونیں ناخن پیوست کر دئیے مگر اس کی رگِ احساس میں بے حس خون میں حرکت نہ ہوئی۔ اور بقول شاعر یہ قومی رہزن "مسکراتا رہا ہے۔ ؎

دیکھا فریبِ رہزنِ دنیا و دیں کہ حشر!
یوں لُٹ کے خوش ہے گویا کہ آیا ہے لوٹ کے

تقلید مغرب نے اس کے مقصد حیات کو آکر فراموش کرا دیا۔ اس کو روحانی ارتقاء کی بجائے ایسا تنزل نصیب ہوا کہ لادینی و مادیت اس کے ایمان کے جزو بن گئے۔ اس کی مذہب و تمدن سے بیزاری کی داستان لکھنے سے قلم لرزتا ہے۔ مذہب و تہذیب نے لسانِ حال سے "مسلمان" کا سلوک بیان کر دیا ؎

کیا کروں ذکر شناساؤں کا دلداروں کا
انہیں محبوب سہاروں نے مجھے لوٹ لیا

کدھر ماضی رنگین اور کدھر حالِ بے حال ہمارے سامنے عقل مندانِ ملت کا پیغام موجود تھا ـــــ ؏

"ماضی کے تجربے سے اصلاح حال کیجئے"

مگر مسلمان نے صرف حیرت طفلانہ کا مظاہرہ کر دیا ـــــ - - - - - - - - - - - - - - - -

- -

- - - - اب ہمیں خداوند تعالیٰ نے پاکستان عطا فرمایا ہے۔ اسے صرف ایک نعمت عظمیٰ متصور کرنا ہمارے لئے اچھا نہیں یہ ایک آزمائش بھی ہے۔

ہمیں اس کو اسلامی ملک بنا کر داستانِ عظمتِ اسلاف دہرانی ہے۔ مسلمانانِ ارضِ پاک کو جان لینا چاہیئے۔ کہ اب دورِ غلامی بیت چکا۔ اب عہدِ غلامی کی پروردہ عقلِ بیمار کی ناتوانیاں ہمارے لئے مفید نہیں۔ ہمیں ماضی کے تجربے سے اصلاحِ حال کرنا ہوگی۔ قسمت کی غلط بخشی کا رونا رونے کی بجائے خود قصرِ تقدیر کو تعمیر کرنا ہوگا۔ اب باشندگانِ پاکستان کو ان عبرت انگیز اور نصیحت خیز غلطیوں سے بچ کر رہنا ہوگا۔ جن کے ارتکاب سے ہم کو سقرِ غلامی کے آتشیں شعلوں میں جلنا پڑا۔ کاش اب مسلمان غفلت کے پردوں کو چاک کر دیں۔ اور اسلاف پرستی کی بجائے خود داستانِ عظمتِ اسلاف دُہرا کر رنگینِ ماضی کو حال کے پردے پر آشکار کریں!

اے خدا! تو مسلمان کی چشمِ کور کو نورِ بصیرت سے نواز تا وہ تہذیبِ حاضرہ کی ظلمتِ مکروہ (جیسے مسلمان کی نگاہِ تلطف کی بھی سعادت حاصل ہے) کی بے حقیقتی اور بے مائیگی سے واقف ہو جائے تا پھر وہ اپنی کتابِ عروج کو دیمکِ زوال کے حوالے نہ کرے۔

اے قادر و قیوم خدا! تو مسلمان کو قعرِ ذلت کی عمیق گہرائیوں سے نکال جن میں گر کر مسلمان نے جاہِ سکندری۔ دولتِ فریدونی۔ اور جلالِ خسروی سے ہاتھ دھوئے۔

اے چمنستانِ دہر کے مالک! اس کے چمنِ خزاں دیدہ میں سحابِ رحمت کا گزر کرا اور اس چمنِ خزاں رسیدہ کے بے برگ اور خشک اشجار کو ثمر چیدہ کر۔ پھر اسی چمن میں دوبارہ بہارِ بے خزاں لا۔

اے نبضِ ہستی کے نباض! اس مقہور اور بیمار کی مسیحائی کر۔ اور چھوٹتی نبضوں میں ایسا جوہر دار خون بھر کہ آتشِ ایمان گرما جائے۔

اے خیمۂ افلاک کے مالک! اس خوابیدہ کو ہنگامہ آرائے دہر کر دے اسے دوبارہ جلالِ خسروانہ سکندرانہ عظمت۔ اور ثروتِ فریدونی عطا کر۔ اس کو لادینی کے شکار ہونے سے بچا۔ اور ایمان کی خلعت سے آراستہ کر۔ اختلافات کی گتھیوں کو سلجھا اس برگِ زرد کو شادابی سے ہمکنار کر۔ اے پاکستان عطا کرنے والے خدا تو اس پاک وطن کو حصارِ حفاظت میں لے کر اس کے ذرہ ذرہ کو گردشِ دوراں کے آتشبار تھپیڑوں سے محفوظ رکھ۔ اے ہماری اور وطنِ عزیز کے بخشنے والے مالکِ حقیقی ہمیں ہماری گم گشتہ جنتِ عروج و اقبال پھر بخش تا اس کی عرفانی مسرتوں کی لطیف مسکراہٹیں ہمارے محرومِ تبسم لبوں پر کھیلیں —

ہمارے بھی گذشتہ دن ہمیں یارب دکھا دینا!
سُنا ہے تیری قدرت سے گئے دن پھر بھی آتے ہیں

ایاز محمود احمد خان

اشتراکیت

اشتراکیت، سرمایہ داری کا ردِ عمل ہے۔ سرمایہ داری افراط کی طرف مائل تھی اور دولت چند لوگوں کے ہاتھ میں سمٹ کر رہ گئی تھی۔ غریب اور مظلوم لوگ اس سے بہت گھبرا گئے۔ اور وہ کسی بھی [illegible] کو قبول کرنے کے لئے تیار رہتے۔ جو سرمایہ داری کے خلاف ہو۔

کارل مارکس نے اشتراکی نظریات پیش کئے۔ جو کہ سرمایہ داری پر جائز اور ناجائز کاری ضربیں تھیں۔ چنانچہ عوام نے انہیں قبول کرنا شروع کیا۔ اور ان کے پیش نظر محض یہی تھا کہ وہ کسی نہ کسی طرح سرمایہ داری کے چنگل سے نجات حاصل کریں۔ مگر ان بے سمجھ اور نادان غریبوں کو کیا معلوم تھا۔ کہ وہ جس چیز کو اپنے لئے سرابِ راحت خیال کرتے ہیں۔ وہی ان کے لئے وبالِ سر کا موجب ہو گی۔ اور جس بلا سے وہ چھوٹنا چاہتے ہیں اسے وہ خود ایک نئی شکل میں جنم دے رہے ہیں۔

اشتراکیت کا نعرہ کہاں کارگر ہوا؟ صرف ان ہی ممالک میں جہاں عوام شہنشاہیت اور ملوکیت سے سخت نالاں تھے۔ عوام نے ان بظاہر دلفریب نظریات کو سن کر ملک و وطن میں اعلانِ بغاوت بلند کر دیئے۔ اور لوٹ مار کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جسے مذہب تو کجا عام انسانی فطرت بھی کسی صورت میں گوارا نہیں کرتی۔ کسی حد تک عوام کا حق ہوتا ہے۔ کہ وہ اپنے مطالبات پیش کریں اور انہیں اپنی حکومت کے مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے منوانے کی بھی کوشش کریں لیکن قطعی غلط ہے کہ وہ ناجائز طور پر حکومت پر دباؤ ڈالیں۔ یا آئے دن دونی انارکی اور بدامنی پھیلاتے رہیں۔

اشتراکیت کا زیادہ اثر روس میں رونما ہوا۔ جس کی اصل وجہ یہی ہے کہ لوگ زار روس سے بہت اکتائے ہوئے تھے۔ لیکن اب وہی عوام ایک زار کی بجائے کئی زاروں سے پس رہے ہیں۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہزاروں بے قصور اور بے خطا انسانوں کو بغیر وجہ بتائے جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑیوں میں ٹھونسا جاتا ہے۔ اور جیسا سلوک بیریا کے ساتھ ہوا اس پر آئندہ آنے والے مؤرخ بھی آنسو بہائیں گے۔

اشتراکی رہنماؤں نے ادعا تو یہ کیا تھا کہ ہم امیر و غریب بندہ و آقا میں مساوات قائم کر دیں گے۔ مگر جتنی امیر و غریب کی تمیز وہاں ہے شاید ہی کسی اور ملک میں ہو۔ روس کے اربابِ اقتدار اب خود یہ اعتراف کر رہے ہیں۔ کہ سٹالن کے وقت اشتراکی نظریات پر عمل نہیں کیا جا رہا تھا۔ اور سٹالن خود بھی لینن نظریات پر عمل پیرا نہیں تھا۔ اور روسی لیڈر یہ بیان دیتے ہیں کہ سٹالن آمریت کا پتلا تھا۔ اور کسی کو اس کے سامنے دم مارنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی سٹالن کی سوانح کا ایک ایک لفظ بتاتا ہے کہ وہ من مانی کارروائیاں کرتا تھا۔ اس نے ہر کام اپنی مرضی سے کیا۔ اور اس میں کسی کو دخل اندازی کی اجازت نہ تھی۔ تو ان حالات سے طبعاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ آیا اشتراکی نظریات صحیح بھی ہیں۔ اور یہ انسانی فطرت کے مطابق ہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ اشتراکی نظریات قانونِ قدرت کے صریح خلاف ہیں۔ مثلاً غلط مساوات کا

عطاء الکریم شاہد

موجودہ مشاعرے اور ادب

(کالج کے شاعر حضرات سے معذرت کے ساتھ!)

ضروری نہیں کہ ادارہ مضمون نگار کے افکار سے متفق ہو۔

اس ناقابلِ انکار تاریخی حقیقت سے فرار ممکن نہیں کہ جب بھی کسی قوم کا ادب ترقی کرتا ہے۔ وہ زوال کی طرف کشاں کشاں بڑھنے لگتی ہے۔ اور جب کوئی قوم عظمت سے ہم کنار ہوتی ہے۔ تو اس کا ادب زوال ہو جاتا ہے۔ تاریخِ عالم اس کی بیسیوں مثالیں اپنے سینہ میں چھپائے ہوئے ہے۔ اسی فلسفہ کو علامہ اقبالؒ نے اپنے اِس شعر میں بیان کیا ہے۔

"جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں
انہیں مذاقِ سخن نہیں ہے"

تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ عہدِ قدیم میں بھی آجکل کی طرح مشاعروں کا رواج تھا۔ مگر ان مشاعروں اور آجکل کے مشاعروں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ صرف اتنا جان لینا ایک حد تک کافی ہے کہ پرانے زمانے کے مشاعرے تحت اللفظ ہوا کرتے تھے۔ صرف ان شعراء کو داد و تحسین کا مستحق سمجھا جاتا جن کا کلام با معانی، سبق آموز اور علم و فضل کی طرف راہنمائی کرنے والا ہوتا تھا ایسے شعراء ہرگز قابلِ التفات نہ سمجھے جاتے۔ جن کا کلام ان اوصاف سے یکسر خالی ہوتا۔ ان وجوہات کی بناء پر یہ مشاعرے نہ صرف شاعری کی ترویج کا باعث بنے بلکہ حقیقی ادب کی طرف راہنمائی کا شرف بھی انہیں حاصل ہوا۔

آج زمانہ بدل چکا ہے آجکل کے مشاعرے اُن خصوصیات سے عاری نظر آتے ہیں۔ جو زمانہ گذشتہ کے مشاعروں کا طرۂ امتیاز سمجھی جاتی تھیں۔ عہدِ حاضر کا شاعر علم و فضل اور عقل و دانش کا سہارا لینے کی بجائے خوش الحانی کا سہارا لیتا ہے۔ وہ ترنم سے غزل گا کر اہلِ محفل پر چھا جانا چاہتا ہے اور اپنی علمی خامیوں کو اپنی دلکش آواز کے پردہ کے پیچھے ڈھانپ لینے کی سعیٔ مذموم میں سرگرداں نظر آتا ہے چنانچہ ماضی اور حال کا موازنہ کرنے سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ اگر عہدِ ماضی میں بالغ نظر شعراء قوم کی متاعِ عزیز سمجھے جاتے تھے تو آج المیہ یہ ہے کہ نہ صرف اسکے بالکل برعکس ہے بلکہ گویّے قسم کے لوگ جنکو شعر و شاعری کے لطیف احساسات سے دور کا واسطہ تک نہیں ہے۔ شاعر بن چکے ہیں۔ یا اس کوشش میں مصروف نظر آتے ہیں۔ نتیجہ کے طور پر زمانہ شاعری کے حقوق کو صحیح معنوں میں ادا کرنے والے لوگوں سے خالی ہوتا چلا گیا ہے اور شاعری کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچا۔ کیونکہ وہ اپنے حقیقی سرپرستوں کی سرپرستی سے محروم ہو چکی ہے۔ ادب کی اس شاخ کو نقصان پہنچانے کی ذمہ داری موجودہ شاعروں پر عائد ہوتی ہے۔ کیونکہ شاعروں میں شرکت کرنے والے بلند پایہ شعراء آواز اور ترنم جیسی گویوں کی صفات سے محروم ہونیکے باعث دل برداشتہ کر دئے گئے۔

کشمکشِ حیات میں "ادب برائے ادب" کسی بھی فردِ بشر کے لئے چنداں مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔ ادب برائے زندگی ہی زندگی کے عملی میدان میں کسی انسان کی راہنمائی کر سکتا ہے صحتمند ادب کا واحد مقصد معاشرہ کے نقائص کی نقاب کشائی اور شاہراہِ ہدایت پر چلنے کی ترغیب دینا ہے۔ اس طرح حقیقت سے فرار ناممکن ہے کہ موجودہ مشاعرے ہمیں حقائق کی دنیا سے دور لے جا کر خیالات کی دنیا میں بسانا چاہتے ہیں۔ مگر آجکل کے عملی دور میں حقائق سے آنکھیں پھیر لینا جنت الحمقاء میں بسنے کے مترادف ہے۔ اس سے اظہر من الشمس ہے کہ موجودہ مشاعرے ادب کو بحیثیت "ادب برائے زندگی" نقصان پہنچا رہے ہیں۔

دورِ حاضر کے مشاعروں میں پڑھی جانے والی غزلیں ہمارے معاشرہ کو غلیظ خیالات سے ملوث کر کے روبہ زوال ہونے میں مدد کر رہی ہیں۔ کیونکہ عریانی، حسن اور ہجر و وصل کے قصّے اس کا جزوِ لازمی بن چکے ہیں۔ نیز ان مشاعروں کی وجہ سے عوام کی توجہ غزلیات کے سوا شاعری کی دوسری اصناف سے ہٹ گئی ہے۔ پس آجکل کے مشاعرے ہی ہمارے ادب اور معاشرہ کے انحطاط کے ذمہ دار ہیں۔

تاریخِ علم کے اوراق اس حقیقت پر شاہد ناطق ہیں۔ کہ جہاں کہیں بھی آجکل کی قسم کے مشاعروں کا دور دورہ ہوا وہاں صحتمند اور سنجیدہ ادب عنقا ہو کے رہ گیا۔ میں صرف ایک مثال پیش کرتا ہوں۔ آج سے تقریباً چودہ پندرہ سو برس قبل سرزمینِ عرب میں بالکل ایسی قسم کے مشاعروں کا رواج تھا جس قسم کے مشاعرے آجکل ہمارے ہاں ہو رہے ہیں یعنی جو منظوم کلام ان میں پڑھا جاتا وہ جنسی خیالات کا حامل اور ہجر و وصل کے قصص پر مشتمل ہوتا۔ چنانچہ اس زمانہ میں سنجیدہ اور پاکیزہ ادب پر جمود طاری ہو گیا۔ اگر تاریخِ عرب میں حقیقی ادب کا سراغ ملتا ہے۔ تو مشاعروں اس دور سے پہلے یا اس کے بعد۔

مجھے تسلیم ہے کہ موجودہ مشاعرے ہمیں خوابوں کی جنت میں بسا سکتے ہیں۔ ہمیں حال و مستقبل سے بے نیاز و بے خبر کر سکتے ہیں لیکن ان کا یہ پہلو کچھ خوش آئند نہیں ہے بحیثیتِ مجموعی زمانۂ حال کے مشاعرے ہمارے ادب کے لئے نقصان رساں ثابت ہو رہے ہیں۔ یہ حقیقت ہے تو تلخ۔ مگر اعتراف کئے بغیر چارہ کار نہیں۔ کیونکہ ؎

"میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند"

"اشتراکیت"

بقیہ ص۹

نعرہ چونکہ ہر چیز میں کچھ نہ کچھ فرق پایا جاتا ہے۔ تو ضروری ہے کہ مخلوقِ انسانی میں بھی فرق ہو۔ یہ نظریات ہر لحاظ سے غلط ہیں۔ نہ تو فطرت ہی ماننے کے لئے تیار ہے اور نہ ہی قدرت اس کی اجازت دیتی ہے۔ اور پھر عملاً اشتراکی لوگ باوجود سعی کے آج تک اس مساوات کو رواج نہیں دے سکے۔ آج تک نہ تو روس ہی ان نظریات پر عمل کر سکا ہے۔ اور نہ ہی کوئی دوسرا اشتراکی ملک۔ اور نہ ہی ان نظریات پر کبھی کوئی ملک عمل کر سکے گا۔ اور یہی امر اس بات کا واقعاتی اور تجرباتی ثبوت ہے۔ کہ اشتراکی نظریات سراسر غلط ہیں۔ الغرض سرمایہ داری نے افراط کی راہ اختیار کی اور اشتراکیت نے تفریط کی۔ لیکن اسلام نے اعتدال پر چلنے کی ہدایت کی۔ اور اپنے متبعین کو ایک ایسا راستہ بتایا۔ جو قانونِ قدرت کے مطابق ہے۔ اور انسانی فطرت اس کے ماننے کے لئے مجبور ہے۔

درمیانی راستہ صرف اللہ تعالےٰ ہی بتا سکتا ہے

صرف اور صرف اسلام ہی وہ درمیانی راستہ اور صراطِ مستقیم ہے جس پر چل کر انسان اس لعنت سے بچ سکتا ہے +

رفیق احمد اختر سکنڈ ایر

اور چاند روتا رہا

چائے صاف کرنے کی مشین کو چلانے کیلئے پانی کافی بلندی سے لایا جاتا تھا جو کارخانے کے نیچے سے ہوتا ہوا نالے کی صورت میں بھیانک غاروں کی طرف بہہ جاتا تھا

میرا پرائمری سکول اس کارخانے کے پہلو میں واقعہ تھا۔ ایک روز نصف چھٹی کے وقت میں سکول کے میدان میں کھڑا بلند چوٹیوں پر بکھری ہوئی چاندی کی سی برف کو دیکھ رہا تھا۔ کہ کسی نے پیچھے سے آکر میری آنکھیں بند کر دیں۔ تو میں نے حسبِ معمول ہاتھوں اور بازوؤں کو ٹٹول ٹٹول کر پہچاننے کی کوشش کی۔ یک دم جانی پہچانی انگوٹھی پر ہاتھ لگا۔ اور چلا کے کہا "ارے واہ! موہن اور کون" موہن نے جھٹ آگے بڑھ کر میری جیب چلغوزوں اور سونت کے دانوں سے بھر دی۔

"رفیق یہ تم چوٹیوں کی طرف کیا دیکھتے رہتے ہو ——؟ چلو نالے سے جا کر مچھلیاں پکڑیں"

نالے کے کنارے ایک سانپ ایک ننھے سے مینڈک کو جبڑوں میں دبائے نگلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ موہن نے سانپ کو دم سے پکڑ کے گھمانا شروع کر دیا۔ اور پھر اُسے پتھر پہ پٹخ کر اسکا کچومر نکال دیا۔

"بڑے نڈر ہو تم موہن" "ارے بھئی یہ زہریلے نہیں ہوتے۔ لیکن یہ اپنے سے چھوٹوں کا خون کیوں چوستے رہتے ہیں۔؟"

میں نے جواب میں کہا "ماسٹر جی نے کہتے تھے دنیا میں ہر طاقت ور اپنے سے کمزور کی ہڈیاں تک چبا جانا چاہتا ہے" موہن نے سانس کھینچتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو رفیق تم اب پاکستان چلے جاؤ گے۔ وہ دُوران پہاڑوں سے پرے اب میں چلغوزے کسے دیا کرونگا چائے کے کھیت میں پھول توڑنے کس کے ہمراہ جایا کرونگا ۔ بھگوان کی قسم تمہارے جانے کے بعد میری باڑی سونی پڑ جائے گی —— تم صبح دعا کتنی اچھی کہلوایا کرتے تھے —— لیکن تمہارے یہاں سے چلے جانے کے بعد گھنٹی بجتے ہی لڑکے کمروں میں چلے جایا کریں گے۔ اور میں تمہاری دعا کے شعر دہرا دہرا کر تمہیں یاد کیا کروں گا"

ہے ہر وقت تجھ پہ سہارا ہمارا
تو دنیا میں سب سے ہے پیارا ہمارا
تری یاد سے دل کو تسکین آئی
ترا نام آنکھوں کا تارا ہمارا

موہن نے گفتگو جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"لیکن تم جانے سے پہلے مجھے ایک آدھ نشانی تو دے جانا۔ اور رفیق ماسٹر جی نے تمہاری جگہ پیارے لال کو

مانیٹر کیوں بنا دیا۔؟ حالانکہ تم سب سے پہلے سوال نکال لیتے ہو۔ اور معنے بھی تو تم سب سے زیادہ بتاتے ہو" میں نے جواب دیا دو لڑکے کہہ رہے تھے۔ کہ ماسٹر جی مسلموں کو مانیٹر نہیں بنایا کرتے"۔ کچھ دن بعد ہم ہسپتال کی گاڑی میں بھاگسو کا مندر دیکھنے گئے۔ یہ کانگڑہ کا بلند ترین قصبہ ہے۔ ابا جان نے ہمیں بتایا تھا کہ یہ وہی مقام ہے جہاں کبھی محمود غزنوی کے گھوڑوں نے آکر گھاس چری تھی۔ یہ وہی فضا ہے جو کہ اللہ اکبر کے نعروں سے تھرا اٹھی تھی۔ یہ وہی بت خانہ ہے جہاں برہمنوں نے لاکھوں کا زر و جواہر محمود کے قدموں میں ڈھیر کر دیا تھا۔ جہاں پانچ وقت کی آذان ہمالہ کو ہلا دیا کرتی تھی —— لیکن اب یہاں آئے دن وارداتیں بھجن ہوا کرینگے"۔

کانگڑہ بھر میں مسلمانوں کو قتل دفنا کیا جانے لگا تھا۔ اس لئے میں نے بھی سکول جانا بند کر دیا تھا کیونکہ پنجاب کے دوسرے علاقوں سے سکھ آرہے تھے اور کانگڑہ کے ڈوگروں۔ گدھیوں اور پہاڑیوں سے مل کر انہوں نے مسلمانوں کو ٹھکانے لگانے کی سکیموں پر غور کرنا شروع کر دیا تھا۔ اب میں دن بھر یونہی کیمپ کی سڑکوں پر سلاخ سے لوہے کا پہیا چلایا کرتا۔ یا دیودار کی جھاڑیوں کے گرد گھومتا رہتا۔ اور یا پول کیمپ ہسپتال کے Recreation Room میں جا کر سگرٹوں کے ٹکڑے اکٹھے کر لاتا۔ اور ان کا تمباکو اخبار کے کاغذ میں ڈال کر فٹ بھر لمبا سگرٹ تیار کر لیتا۔ اس کے ایک دو ہی کش لگانے کے بعد طبیعت

ہری ہو جاتی۔ ہوش اسوقت آتی جب ابا جان ہسپتال سے آکر کان سے پکڑ کر اٹھاتے۔ ایک شام جونہی چاند نے برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیوں پر اپنی شعاعیں پھینکنی شروع کیں۔ تو نگروٹے اور پالم پور کی طرف سے دھوئیں کے بادل بلند ہونے شروع ہوئے —— اطلاع ملی کہ منڈی میں مسلمانوں کے سب گھر راکھ کر دیئے گئے ہیں اور نگروٹہ دسوباڑی وغیرہ کے علاقوں میں زور شور سے مکانوں کو آگ لگانے اور مسلمانوں کے قتل و غارت کا سلسلہ شروع ہے۔ اس کے تین دن بعد یول کیمپ کی خاردار تاروں سے گھری ہوئی بیرکیں مسلمانوں پناہ گزینوں سے بھر چکی تھیں۔

سب سے پہلے مکانوں کو آگ لگا کر مسلمانوں کو میدانوں میں اکٹھا کر لیا جاتا۔ اور ان کے گرد گھیرا ڈال کے کلہاڑیوں اور ٹوکوں سے کوؤں اور چیلوں کے لئے دعوت تیار کر دی جاتی۔ جوان لڑکیوں کو آپس میں بانٹ لیا جاتا اور جو کوئی کھیتوں میں چھپ چھپا کے بچتے وہ یول کیمپ میں آکر پناہ لیتے ہسپتال کی ایمبولنس گاڑیاں ضلع بھر کا چکر لگا کر زخمیوں کو اکٹھا کرتیں۔

ایک دن ابا جان صبح کے گئے رات دس بجے ہسپتال سے واپس آئے۔ ان کی وردی پر جگہ جگہ خون کے داغ لگ رہے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ہسپتال کی فرلانگ فرلانگ لمبی وارڈیں زخمیوں سے بھر چکی ہیں۔

دوسری شام کو ہم سب وارڈز میں زخمیوں کی خبر گیری کیلئے گئے —— کراہنے کی آوازوں سے ہسپتال میں اداسی چھا گئی تھی۔ دوپہر سے ابتک کئی مریض ختم ہو چکے تھے

خون کی بُو سے ناک پھٹا جا رہا تھا۔ کسی کی ٹانگ کٹی ہوئی تھی۔ تو کسی کی کھوپڑی پھٹی تھی۔

ہم سب کے آنسو بہہ رہے تھے ——— ایک بستر میں سے آواز آئی "اماں چھلی۔ اماں سیب"۔ امی نے اُسی وقت نوکر کو گھر بھیجا تاکہ بھٹے بھون کر لائے۔ اور ہسپتال کے سٹور سے اباجان نے سیبوں اور کھیروں کی ٹوکری منگوا کر ہوشمند زخمیوں میں تقسیم کی ——— یہ اماں چھلی۔ اماں سیب کرنے والا مریض بارہ تیرہ سال کی سیب کے سے گالوں والی ایک لڑکی حلیمہ تھی۔ اسکی کنپٹی میں چھرے کا گہرا زخم تھا۔ اور بازو کی ہڈی ٹوٹی ہوئی تھی۔ جسے اپریشن کر کے جوڑ اگیا تھا۔ اس کا ایک نو سالہ بھائی اسلم اسکے پاس ہی چارپائی پر بیٹھا تھا۔ اس کے بازو اور پنڈل پر معمولی زخم تھے۔ انکا ایک اور پندرہ سالہ بھائی اشرف پانچویں بستر پر بیہوش پڑا تھا۔ اس کے سر میں گہرا زخم تھا۔ اس کے علاوہ سارا جسم زخموں سے بھرا پڑا تھا۔

غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا تھا۔ کہ اگر دوسروں کا ڈھانچہ تیار کرنے میں ایک منٹ لگا ہو گا۔ تو اس حسین مگر بدنصیب پر پانچ منٹ صرف ہوئے ہونگے ——— پھرتیلے ہرن کی سی نیلی آنکھیں۔ اور سفید ملائم گال ——— اسلم کی زبانی علم ہوا کہ وہ پالم پور کے رہنے والے ہیں۔ سکھ وحشیوں نے مکان جلانے کے بعد مسلمانوں سے کہا چلو تمہیں پاکستان چھوڑ آئیں۔ اور بھیڑوں کی طرح دس ہزار مسلمانوں کو گھیر کر شہر سے باہر لے آئے اور مارکٹائی شروع کر دی۔

اسلم نے بتایا کہ ہماری آنکھوں کے سامنے سنگ دل درندوں نے ہمارے باپ چچا۔ چچازاد تین بھائی اور دو جوان بھائیوں کو ننگے کر کے قتل کیا۔

اسلم خود ایک دو زخم کھانے کے بعد مکی کے کھیت میں چھپ گیا۔ حلیمہ اور اشرف یُول کیمپ ہسپتال والوں کو بیس شہیدوں کی لاشوں کے ڈھیر تلے سے ملے تھے ——— رات ہو چکی تھی۔ ہم مریضوں میں پھل اور بھٹے تقسیم کرنے کے بعد گھر آ گئے۔ اور اباجان رات کو ڈیوٹی کے لئے ہسپتال میں ہی ٹھہرے رہے ——— دوسرے دن فرشتہ صورت اشرف کی روح مظلوم وادی سے پرواز کر کے اپنے مولا سے جا ملی۔

حلیمہ اور اسلم ٹھیک ہو رہے تھے۔ اسلم اکثر ہمارے ہاں آتا اور ہم سارا سارا دن کھیلتے رہتے۔ مکان جلتے رہے۔ مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جاتی رہی۔ اور بھاگسو کے بتوں کو خوش کیا جاتا رہا۔ اور چاند ہمالہ کے دامن میں آنسو بہاتا رہا

پناہ گزینوں کے قافلے پاکستان جانے لگے اور ہم بھی ایک دن اس پاکستان میں داخل ہونے کیلئے روانہ ہو گئے جسے حاصل کرنے کیلئے اشرف اور اس جیسے ہزاروں جانبازوں نے اپنے خون سے ہولی کھیلی تھی۔ اور ہم بھی اس پاکستان میں آزادی کا سانس لینے کے لئے رواں دواں تھے ——— اور چاند ہمالہ کے دامن میں آنسو بہا رہا تھا ——— سفید آنسو ——— سرد آنسو! +

عزیز احمد طاہر سال اوّل

نہر سویز

● نہر سویز کی کھدائی سے قبل یورپ کے جہازوں کو مشرقی ممالک یعنی ہندوستان، لنکا، جزائر غرب الہند اور چین وغیرہ کی بندرگاہوں تک مال پہنچانے اور ان ملکوں کا مال یورپ کی بندرگاہوں میں لانے کے لئے افریقہ کا طویل چکر کاٹنا پڑتا تھا۔ اس سمندری راستے کے علاوہ ایک اور بھی تجارتی راستہ تھا۔ یعنی یورپ کا مال فلسطین اور مصر کی بندرگاہوں میں اُتارا جاتا۔ اور وہاں سے اس کو اونٹوں کے کاروان فلسطین۔ صحرائے سینا اور حجاز سے گزر کر یمن سے ہوتے ہوئے عراق اور ایران میں لاتے تھے۔ پھر ان ممالک سے یہ مال بادبانی کشتیوں کے ذریعہ ہندوستانی بندرگاہوں اور مشرقی ایشیاء کے ممالک تک لایا جاتا ہے۔ اس طرح سفر میں کافی مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔

● اس مشکل کو دور کرنے کے لئے آٹھویں صدی عیسوی میں بحرۂ قلزم اور بحرۂ روم کو ملانے کا منصوبہ خلیفہ ہارون الرشید نے بنایا۔ لیکن وہ اُسے عملی جامہ نہ پہنا سکے۔ اس کے بعد پندرھویں صدی کے اواخر میں جب واسکوڈے گاما نے ہندوستان جانے کے لئے راس امید کا راستہ دریافت کیا۔ تو مصریوں کو اس نہر کو کھدوانے کی تجویز بتائی گئی لیکن ترکوں نے اس تجویز کی مخالفت کی۔ ۱۶۷۱ء میں فرانسیسیوں نے دوبارہ یہ تجویز پیش کی۔ ۱۷۷۰ء میں اس تجویز کو شیخ البلاد علی بے نے منظور کر لیا۔ ۱۷۹۸ء کو نپولین بوناپارٹ نے سروے کروایا فرانسیسی انجینئروں میں اس بات پر اختلاف ہو گیا کہ چونکہ بحیرۂ قلزم اور بحیرۂ روم کی سطح میں ۲۹ فٹ کا فرق ہے۔ اس لئے اس نہر کا قیام ناممکن ہے۔

● آخر کار ۱۸۵۴ء میں ایک فرانسی انجینئر فرڈی ننڈ دی لیپس نے دونوں سمندروں کو ملانے کے لئے مصر کے وائسرائے سعید پاشا (جو اس کا دوست تھا) اجازت حاصل کی۔ اور اس مقصد کے لئے آج سے سو سال قبل ۱۸۵۶ء میں بیس کروڑ فرانک کے سرمایہ سے ایک کمپنی قائم ہوئی۔ اور اس کمپنی کے لئے ۴۰ حصے جاری کئے گئے۔ ہر حصہ پانچ سو فرانک کا تھا۔ اس کمپنی کے سب سے زیادہ حصے مصری حکومت کے بعد فرانس میں خریدے گئے اور اس کے بعد ٹرکی میں خریدے گئے۔ انگلستان روس اور امریکہ نے اس میں کوئی دلچسپی نہ لی۔ بعد میں نومبر ۱۸۷۵ء کو مصر نے تقریباً چالیس لاکھ پونڈ کی مالیت کے اپنے حصے برطانیہ کے پاس بیچ دیئے اس طرح نصف سے زیادہ حصے برطانیہ کی ملکیت

میں آگئے۔ آج سے آٹھ برس پہلے ان حصوں کی قیمت اٹھتر لاکھ پندرہ ہزار آٹھ سو ترانوے پونڈ تک پہنچ چکی تھی۔

● اپریل ۱۸۵۹ء کو کمپنی نے نہر کی کھدوائی کا کام شروع کر دیا۔ اس کام کی رفتار بہت سست تھی۔ ایک معاہدہ کی رو سے مصر نے وعدہ کیا تھا۔ کہ وہ لیبر (Labour) کا ۱/۵ حصہ خود دے گا۔ لیکن مزدوری کم ہونے کی وجہ سے مصر کے لوگوں نے کوئی خاص توجہ نہ دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مزدوروں میں کمی واقع ہو گئی۔ اور کام کی رفتار سست پڑ گئی۔ اس کمی کو پورا کرنے کیلئے سعید خدیو نے جبری بھرتی شروع کر دی ۱۸۶۴ء میں سعید خدیو کے بعد جب اسمٰعیل خدیو آیا۔ تو اس نے اس جبری مزدوری کو ناپسند کیا۔ اور ایک منصوبہ تیار کیا۔ جس کی منظوری سلطان ترکی نے دی۔ اس منصوبہ کی رو سے جبری مزدوری کو منسوخ کیا گیا۔ یہ نہر آخر کار دس سال میں اختتام پذیر ہوئی۔

● ۱۸۸۸ء کو کمپنی اور حکومت کے درمیان ۹۹ سال کا معاہدہ ہوا۔ جس کی چند اہم دفعات درج ذیل ہیں۔

۱۔ کسی جھنڈے کے امتیاز کے بغیر نہر سویز جنگ و امن دونوں زمانوں میں تجارتی یا جنگی جہازوں کے لئے ہمیشہ کھلی رہے گی۔

۲۔ معاہدین اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ بحری نہر کے ساتھ ایک صاف پانی کی جو نہر ناگزیر ہے۔ معاملہ میں کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی۔

۳۔ معاہدین نصب شاہ پلانٹ، منصوبات عمارات اور جہاز رانی سے متعلق دوسرے کاموں میں مداخلت نہ کرنے کا وعدہ کرتے ہیں۔

۴۔ معاہدین اس بات کا اقرار کرتے ہیں۔ کہ نہر سویز اور اس کی بندرگاہوں سے تین میل کے قطر کے اندر کوئی جنگی اقدام نہ کریں۔ اور نہ آزادانہ جہاز رانی میں کوئی رکاوٹ ڈالی جائے گی۔

۵۔ معاہدین طاقتوں کے ایجنٹ معاہدہ کی تکمیل کی نگرانی کے لئے مامور کئے جائیں گے۔ سال میں ایک دفعہ ان ایجنٹوں کے رکنِ اعلیٰ کی صدارت کا اجلاس ہوا کرے گا۔

۶۔ معاہدین نہر سویز کے آزادانہ استعمال کے مساویانہ اصول پر جو موجودہ معاہدہ کی بنیاد ہے۔ اس بات کا اعلان کرتے ہیں کہ وہ نہر سویز سے علاقائی یا تجارتی مفادات کو حاصل کرنیکا کبھی خیال بھی نہ کریں گے۔

۷۔ معاہدین اس بات پر متفق ہیں۔ کہ وہ موجودہ معاہدہ کی ذمہ داریوں پر عالمی سویز کینال کمپنی کے مراعات ایکٹ کے اپنی مدت تک کسی قسم کی پابندی عائد نہ کریں۔

(باقی ٹائیٹل صفحہ کالم ۱)